اردو کی نمائندہ مترجم خواتین میں زینت حسام کا ادبی مقام و مرتبہ

Zeenat Hassaam's literary position among Representative Females of Urdu Literature

i شاذیہ پروین ii ڈاکٹر شگفتہ حسین

Abstract:

Translation is an indispensable tool for turning the concept of world literature into a concrete reality. The process of translation serves as a bridge between two languages. The female translators mentioned in this article have a prominent and unique place in Urdu literature. These women have explained the most prominent points of the, civilization and society of their time in every way and these representative women are also recognized as the identity of Urdu literature in the sense that they not only developed the cultural features of their mother tongue. In his writings, Ikasi described not only the culture and way of life of foreign countries, but also their practical life and individual and collective problems. These women made their own literary identity in this journey of consciousness. Zeenat Hussam has written articles on individual strength and forced labor since her retirement from the Pakistan Institute of Labor Education on Selected translations on world and science fiction.

Keywords: *Translations, Indispensable Tools, Concrete Reality, Science Fiction and Representative Women.*

عالمی ادب کے تصورات کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے تراجم کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ترجمہ دو زبانوں کے درمیان روابط اور ہم آہنگی کا ذریعہ بنتا ہے۔ ادب میں ترجمہ کثیر الجہات فوائد کا حامل عمل ہے۔ خواتین ترجمہ نگاروں نے اردو ادب میں نمایاں اور منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ خواتین ترجمہ نگاروں نے اپنے اپنے عہد کے اہم معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ نمائندہ خواتین بلاشبہ اردو ادب کی شناخت کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نام زینت حسام کا ہے جس پر اس مقالے میں بحث کی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: تراجم، ناگزیر وسائل، سائنسی افسانے، نمائندہ خواتین، زینت حسام۔

انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں ترجمے نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ سماجی ارتقاء کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ زبانوں کے آپس میں سمجھوتے اور باہمی میل جول سے انسانی معاشروں نے بھرپور استفادہ کیا۔ ایک معاشرے نے دوسرے معاشرے کے تجربات و مشاہدات کو مشعل راہ بنایا، اور پھر ایک اور امتحان سے اس وقت سامنا ہوا جب انسانوں کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک کوچ کرنا پڑا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب دوسری آبادی میں رائج زبان کا جاننا اور اس انسانی گروہ کے خیالات و تصورات سے آگاہی ناگزیر بنی۔ اسی مرحلے پر ترجمے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

ترجمہ نگار اپنے گہرے شعور اور تجربے سے ایسے مناسب الفاظ کا چناو عمل میں لاتا ہے جن سے

i پی ایچ۔ ڈی سکالر، شعبہ اردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان۔
ii پروفیسر ایمرائیٹس، شعبہ اُردو، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان (Corresponding Author)

ایک قوم کے علوم سے دوسری اقوام کے علوم میں جدت و رعنائی کے نئے دھارے وجود میں آتے ہیں اس لیے ترجمے کے ذریعے زبان میں نئے انسانی و سماجی علوم سامنے آتے ہیں جو زبان کی نشو و نما اور ترقی میں سنگ میل کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ترجمہ وہ عمل ہے جس کے ذریعے ترجمہ نگار اپنے معاشرے کے افراد کی سماجی و ثقافتی رہنمائی کی راہیں ہموار کرتا ہے اسی لیے ترجمہ نگار دو مختلف اقوام کے درمیان سماجی پلیٹ فارم مہیا کرتا ہے۔ ہے ایک طرف تو ترجمہ کے ذریعے انسانی علوم میں نت نئی ایجادات سامنے آتی ہیں تو دوسری طرف ترجمے کی بدولت جدید ٹیکنالوجی سے مستفید ہونا آسان ہو جاتا ہے ذہن کی حدود وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح مختلف زبانوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملتے ہیں یوں ترجمے کو گماں کا ممکن کہ سکتے ہیں۔ اردو ترجمے کی روایت کی تلاش کی جائے تو افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس کا کوئی خاص پس منظر سامنے نہیں آتا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ترجمے کے عمل میں سامنے آنے والی مشکلات کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے اس میں مترجم، مصنف کی شخصیت، فکر و اسلوب سے بندھا ہوتا ہے ایک طرف اس زبان کا کلچر، جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر، جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے، یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے۔“[۱]

کلاسیکی عہد میں بیشتر کتابیں فارسی ادب کا ترجمہ ہیں۔ انگریزوں نے اگرچہ ہماری تہذیب، تمدن اور ادبی شناخت کو ملیا میٹ کیا لیکن دوسری طرف اس کی ترویج و ترقی میں بھی بڑا حصہ اس طرح ڈال دیا کہ انگریزی زبان کے تراجم اردو زبان میں کروائے اور اس طرح نہ چاہتے ہوئے انگریز نے اردو زبان کی خدمت کر ڈالی۔

ترجمے کے فروغ کا مرحلہ درپیش ہوا تو جن ممالک نے ترجمے کی اہمیت کو سمجھا اور اپنے ملک کی زبان کے فروغ کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے دارالترجمہ بنائے اور اپنی قوم کے افراد کو ایک زیادہ زبانوں سے روشناس کروایا۔ یونیورسٹیوں میں ترجمہ و تالیف کے ادارے قائم کیے وہاں خاطر خواہ نتائج بھی سامنے آئے اور ترجمہ نگاروں کو باوقار مقام ملا لیکن خواتین اپنی ادبی شناخت کے لیے اج بھی مرد ہی کے سامنے جھکنے پر مجبور ہیں۔ اگر کوئی خاتون اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے تو اسے باغی کا نام دینا روایت بن چکی ہے۔۔

اس کا مطلب مرد کو خوش رکھنے کا گر عورت کی تذلیل ہے جس میں وہ تسکین محسوس کرتا ہے۔ عورت کے مرد کے شانہ بہ شانہ کام کرنے سے خانگی نظام تباہ ہو جائے گا اور اس طرح معاشرتی انور میں حصہ لینے سے عورت اپنے فطری فرائض سے کنارہ کشی کرلے گی اس فرسودہ خیال کے تحت مردانہ عصبیت زدہ معاشروں میں عورت کا استحصال ازل سے جاری و ساری رہا ہے . عورت جسمانی طور پر مرد سے کمزور ضرور ہے مگر قدرت نے عورت کو مرد ڈے کسی طرح کمتر درجہ نہیں دیا۔ عورت ذہنی طور پر معذور نہیں اگر اسے اپنی صلاحیتوں کے استعمال کے مواقع میسر ہوں تو معاشی خود کفالتی کی زندگی بہ آسانی گزار سکتی ہے۔ لیکن عورت کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے یا ذاتی تحفظ اور خود انحصاری کے حقوق پر کوئی مثبت اقدامات کیے گئے تو مردوں کے قائم کردہ فرسودہ نظام عورت کی کامیابی میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جب بھی کسی خاتون نے بذریعہ قلم اپنی ادبی شناخت سے شہرت حاصل کی اس مردانہ عدم مساوات کے معاشرے میں پہلا سوال یہی اٹھا کہ عورت کے پس پردہ کوئی مرد ہی ہو سکتا ہے۔ عورت میں یہ قابلیت نہیں ہو سکتی۔ بد قسمتی سے اس سوال کا جواب بھی مثبت ہی رہا ادب میں بھی خواتین کو انھی رویوں کا سامنا رہا۔ جب کسی خاتون نے معاشی طور پر اپنے قدم جمائے تو ان کی گھریلو زندگیاں متاثر ہوئیں کیوں کہ طاقت ور اور بے لگام امریت زدہ مرد نے عورت کی اس ترقی کو بے جا آزادی اور فحاشی کے القابات سے نوازا۔ ازدواجی زندگی کی کامیابی کا دارومدار عورت کی تذلیل تو نہیں لیکن مردوں کا نظریہ یہ ہے کہ عورت اگر خود کفیل ہو گی تو اپنی تذلیل برداشت نہیں کرے گی جو کہ مرد کو خوش رکھنے اور کامیاب زندگی گزارنے کا راز ہے اور اسی میں مرد کی تسکین ہے عورت اور مرد دونوں ہی معاشرے میں اہم مقام رکھتے ہیں لیکن عورت کی معاشرے میں ایک فعال رکن کا درجہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

اگرچہ بقول اقبال: ''وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''، لیکن انسانی تاریخ میں عورت کی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ قدیم ادوار کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت گھر کی چار دیواری میں رہ کر بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ ازدواجی تعلقات خوشگوار رکھنے کی ذمہ داری پر معمور تھی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی معاملات میں اس کی شمولیت برائے نام نظر آتی ہے۔ معاشرے کا ایک فعال کردار نبھا کر بھی عورت کی شناخت محض حاشیے کی مانند ہے۔ جہاں تک ادبی مقام و مرتبے کا معاملہ ہے عورت کے لیے ادب

ایک شجر ممنوعہ قرار دیا گیا تھا۔

خواتین ترجمہ نگاروں کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ خواتین ترجمہ نگاروں نے مادری زبان کی تہذیب و ثقافت کے اہم خدوخال کا عمیق مشاہدہ کیا اور اپنے علمی شعور کی بدولت غیر زبانوں کی علمی و ادبی ثقافت کا بغور مشاہدہ کیا اور غیر زبان کے رہن سہن و انفرادی و اجتماعی مسائل کو ادبی تحریروں میں تراجم کے ذریعے بیان کیا اور اپنی منفرد ادبی حیثیت بنائی۔

قرۃالعین حیدر ادب دوست تخلیق کار ہیں۔ تعلیم یافتہ والدین کی تربیت نے قراۃالعین کے اسلوب میں دریا کی روانی اور پختگی کا رنگ دیا۔

ممتاز شیریں اپنے عہد کی باوقار اور ہمہ جہت شخصیت کے طور پر مقبول ہیں۔ اردو، انگریزی، عربی فارسی اور بیشتر علاقائی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے انگریزی ادب کا عمیق مطالعہ کیا اور غیر زبان کے مسائل کو مادری زبان کی معاشی و سماجی مشکلات سے موازنہ کے ذریعے دونوں زبانوں کی مماثلت کا نیا پہلو دکھایا۔ اسی طرح فہمیدہ ریاض نے اپنی زندگی خواتین کے حقوق کے لیے وقف کی۔ انھوں نے نظم و نثر میں جو تراجم کیے ان میں اپنی منفرد پہچان بنائی۔ ان کے تراجم تخلیقی تراجم کا درجہ رکھتے ہیں۔ فہمیدہ نے مردوں کی حاکمیت اور فرسودہ سماجی رسوم۔ کے خلاف آواز اٹھائی۔

کشور ناہید دبنگ شخصیت کی مالک خاتون ہیں۔ کشور نے خواتین کے حقوق کے لیے نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ عملی جدوجہد بھی کی۔ وہ معاشرے میں عورت پر ظالمانہ سلوک، استحصال اور عدم مساوات جیسے رویوں کو بلا جھجک بیان کر دیتی ہیں۔ زاہدہ حنا مشہور افسانہ نگار، ممتاز کالم نگار اور منفرد ادیبہ کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا اسی فہرست میں ایک مشفق نام حمرہ خلیق کا ہے۔ حمرہ نے روزمرہ زندگی کے ہنستے مسکراتے، زندہ دل اور شوخ چہروں کی زندگیوں کا بھرپور عکس اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ حمرہ کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کبھی رومانوی اور تخلیقی کرداروں کا انتخاب نہیں کیا۔ حمرہ کے تراجم کی انفرادیت ان کا خوشنما اسلوب ہے جو ان کی شخصیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی رقم طراز ہیں:

"حمرا خلیق کے تراجم ایک طرف تو تراجم نہیں لگتے بلکہ وہ ان کی جگہ طبع زاد کہانیاں معلوم

ہوتے ہیں اور دوسری طرف ان کہانیوں کا اصل تحریروں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر یہ تعجب ہوتا ہے کہ کہیں پہلا تاثر غلط تو نہیں ہے۔"[۲]

خواتین نے شعور وآگہی کی اس دوڑ میں مختلف شعبوں میں اپنی شناخت بنائی ہے۔اسی فہرست میں ایک معتبر حوالہ زینت حسام کا بھی ہے۔ زینت حسام کا تعلق تعلیم یافتہ اور بااثر گھرانے سے رہا۔ ازدواجی مسائل و مشکلات کے باوجود زینت نے باہمت اور دلیر خاتون کی طرح زندگی میں درپیش مسائل کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ مرد اساس معاشرے نے ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک سفاک معاشرے میں عورت کے ساتھ صدیوں سے روا رکھا جاتا رہا۔ لیکن زینت نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ ہر مشکل کے سامنے لوہے کی دیوار کی مانند کھڑی رہیں زندگی کی پریشانیوں نے زینت کی شخصیت میں خود اعتمادی کا وصف پیدا کیا اور زینت نے ایک نئے اور منفرد اسلوب کی حیثیت سے اپنی شناخت حاصل کی۔ انھوں نے مزدوروں اور غریب طبقے کی مشکلات کا بغور مطالعہ کیا ان کے کرب کو محسوس کیا۔ مزدوروں کے حقوق کے کیے آواز بلند کی ان کی تعلیم و ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ معصوم بچوں پر جبری مشقت کے حوالے سے تحقیق کی۔ مزدوروں کے استحصال کو روکنے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ان کے انوکھے اور دلچسپ اسلوب نے انھیں ادبی حلقوں میں متعارف کروایا۔ زینت نے بطور ناشر سہ ماہی "آج" ہیں دن رات کام کیا۔ انھوں نے گابرئیل گارسیا مرکیز کے انگریزی ناول کا اردو ترجمہ "تنہائی کے سو سال" کے عنوان سے کیا۔ سہ ماہی اج نے گابرئیل گارسیا مارکیز نمبر میں اس ناول کے پہلے تین ابواب کا ترجمہ شامل کیا اگرچہ اس ناول کا ترجمہ نعیم کلاسرا نے بھی کیا جو فکشن ہاوس لاہور سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا لیکن زینت کے ترجمے کو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ملی۔

"مہر سکوت" زینت حسام کی شہرہ آفاق تصنیف ہے۔ زینت نے اس تصنیف میں سائنسی مضامین کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔۔

مہر سکوت۔

ابرہام یہوشوا	مہر سکوت
ڈونلڈ بارتھیم	غبارہ
کیم مونزو	جہاں گرد

اتالو کلو پنو	چاند کی دوری
دانیال الارکون	مسخروں کا شہر
یوسف ادریس	الغریب
گابریئل گارسیامارکیز	تنہائی کے سو سال

مہرِ سکوت

ابرہام یہوشوا (اے بی یہوشوا) کہانی لکھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے ان کا ٹھوس اسلوب اس بات کا گواہ ہے کہ انسانی کیفیات کے مکمل ادراک کی بدولت انھوں نے ادبی حلقوں میں جلد ہی مقبولیت حاصل کی۔ یہوشوا کی کہانی کا اردو ترجمہ زینت حسام نے "مہرِ سکوت" کے عنوان سے کیا۔ اس کہانی میں تنہائی کا المیہ بیان کیا گیا ہے جس میں معذور بچے کی تنہائی کا درد کرب ناک ہے بچپن میں ہی ماں کی موت اس کی تنہائیوں میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ باپ اس کی معذوری کی وجہ سے معاشرے میں شرمندگی محسوس کرتا ہے اور اس سے فاصلہ رکھتا ہے اور یہ فاصلہ اذیت ناک ہے باپ شاعر ہے لیکن اس کی شاعری وقت اور حالات کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ بوڑھے باپ اور معذور بیٹے کے درمیان فاصلہ معاشرے کے نفسیاتی پہلو کی وضاحت کرتا ہے۔

غبارہ

اس مجموعے میں شامل دوسری کہانی ڈونالڈ باتھیم کی ہے۔ ڈونالڈ نے بحیثیت صحافی اپنی پہچان بنائی۔ زینت نے ان کی کہانی کا اردو ترجمہ "غبارہ" کے عنوان سے کیا جو سہ ماہی آج کے خزاں کے شمارے میں ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ غبارہ جو نیویارک شہر پر نمودار ہوتا ہے اس کے متعلق مختلف لوگوں کے نظریے بیان کیے گئے ہیں۔ حکام مایوس ہیں۔ غبارہ ایک علامتی کہانی ہے۔ نیویارک شہر پر چھا جانے والا غبارہ لوگوں کے نفسیاتی پہلو کو واضح کرتا ہے۔ بچے غبارے کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے ہیں تو دوسری طرف حکام بالا خوف زدہ ہیں وہ اس غبارے کو تباہ نہیں کر سکتے۔

جہاں گرد

اگلے کہانی کار جن کی کہانی کا اردو ترجمہ زینت حسام نے "جہاں گرد" کے عنوان سے کیا؛ وہ کیم

مونزو ہیں۔ اس کہانی کا محور ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنی زندگی کے بیس سال سرکس میں گزارے لیکن اب سرکس کا زوال شروع ہوا اس نے بھی سرکس کے پیشے کو خیر آباد کہا اور ایک کمپنی میں کلرک کی نوکری کر لی آدھی زندگی سرکس کی نذر کرنے کے بعد اسے باقی زندگی میں کوئی رنگینی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اب وہ ٹکٹوں پر چھپے شہروں کے نام دیکھتا۔ چالیس برس کی عمر میں ماضی کی یادوں نے اسے گھیر لیا وہ خواب میں سرکس کے عروج کا زمانہ دیکھتا۔ اسے لگتا کہ اس نے سرکس کو چھوڑ کر اپنے شاندار پیشے کو خیر آباد کہہ دیا ہے یہ نفسیاتی رویہ بالآخر غالب آیا اور اس نے اپنی ساری جمع پونجی سمیٹی۔ ریلوے اسٹیشن سے پہلی ٹرین پکڑی اور کھوئے ہوئے لمحوں کا مداوا کرنے کا سوچا۔ لکھتی ہیں:

> ”جس نے آدھی دنیا بیس برس کا ہونے سے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ وہ زندگی کے اگلے بیس سال ایک خاموش، سنسان مکان اور آہنی دروازوں والے دفتر میں ہی گزارتا رہا۔ بیس سال تک وہ ایک ہی سڑک پر چل کر دفتر جاتا رہا۔“[۳]

لیکن اب اسے خواب بھی نہیں آ رہے تھے اچانک اسے شدید ذہنی دباو کے جھٹکے کے بعد احساس ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہے۔ ہر منظر اجنبیت کا احساس لیے ہوئے تھا۔ اس کا ذہن خالی تھا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ در حقیقت وہ اپنی ذات کو ہی فراموش کر چکا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

> ”جب ٹرین آئی تو وہ پہنچان نہ سکا کہ وہ کیا شے تھی نہ اُسے کوئی مشین لگی اور نہ کوئی عفریت ان دونوں لفظوں کے معنی وہ بھول چکا تھا جو چنانچہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ خوف کیا ہے۔ اس نے بچنے کی کوئی کوشش نہ کی۔“[۴]

چاند کی دوری

زینت نے اطالوی افسانہ نگار کی کہانی کو "چاند کی دوری" کے عنوان سے ترجمے کا رنگ دیا۔ اس کہانی میں زینت نے سائنسی فکشن کے فن کا کھل کر اظہار کیا ایک طرف اس کہانی کے ذریعے انھوں نے محبت کو ایک لازوال جذباتی رویے کے طور پر پیش کیا تو دوسری طرف اپنے سائنسی تجربات کے روشن پہلو کو نمایاں کیا۔ لکھتی ہیں:

"اور اس طرح میں کپتان کی بیوی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ اور اس دن سے میرے لیے غمگین دور شروع ہو گیا۔ کیوں کہ مجھے یہ جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ وہ خاتون کس کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتی۔"[۵]

الغریب

زینت حسام نے جتنے بھی تراجم کیے انگریزی زبان سے کیے۔ یہ تراجم زینت کی انگریزی زبان پر مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ مصر کے کہانی کار یوسف ادریس کی کہانی کا ترجمہ زینت نے "الغریب "کے عنوان سے کیا۔ ایک نو عمر لڑکا جو جرم کی دنیا میں دخل ہو کر انسانیت بھول جاتا ہے۔ نوجوان ایسے لوگوں کو پسند کرتا جو رات کے اندھیرے میں راج کرتے۔ انھیں "رات کے فرزند" جیسے لقب دیتا۔ اور خود ان لوگوں کا ساتھی بننے کے خواب دیکھتا۔ اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر عام آدمی گمان نہ کر سکتا کہ اس کا تعلق خطرناک مجرموں سے ہو سکتا ہے مصنف ذہنی کیفیات کو بیان کرتا ہے اس زندگی میں آپ کسی پر بھروسہ نہیں کر تیمے وماور نہ ہی آپ پر کوئی یقین کرتا ہے۔ مرنا چاہو تو مر بھی نہیں سکتے الغریب بے بسی سے چاند کو گھورنے لگا:

"اگر تم اس کو قتل کر دیتے تو کم از کم مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اب تم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اگر کوئی ایک با قتل کر بیٹھے تو وہ اس مادہ بھیڑیے کی مانند ہو جاتا ہے جو اپنے ہی بچوں کو کھا جاتی ہے۔"[۶]

مسخروں کا شہر

اسی طرح لاطینی امریکہ کے افسانہ نگار الار کون کی کہانی کا ترجمہ "مسخروں کا شہر "کے عنوان سے کیا۔ اس کہانی میں لاطینی امریکہ کی عوای ثقافت کا پہلو نظر آتا ہے۔ پس پردہ لیما شہر اور اور جگہ جگہ گھوم کر چیزیں بیچنے والوں، کرتب دکھانے والوں کا رہن سہن نظر آتا ہے۔

تنہائی کے سو سال

تنہائی کے سو سال گابرئیل گارسیا مارکیز کا تحریر کردہ ایک طویل ناول ہے۔ اس ناول کا ترجمہ نعیم کلاسرا نے بھی کیا ہے دوسرا مکمل ترجمہ زینت حسام نے کیا جو ۲۰۲۰ء میں سہ ماہی "آج" کراچی سے شائع ہوا۔ گابرئیل کے ناولوں میں ماضی حقیقت اور رومان کا مرکب پایا جاتا ہے۔ ان کے ناول حقیقت اور تصور پر

مبنی ہوتے ہیں جن میں جادوئی حقیقت نگاری بھی شامل ہوتی ہے۔

تنہائی کے سو سال ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے جس کی سات نسلوں کی مختصر روداد ابتائی گئی ہے ارسلا اور میکانڈو مرکزی کردار ہیں جو اپنے اپنے خاندان کی مخالفت مول لے کر شادی کرتے ہیں۔ میکانڈو خواب میں ایک شیشے کی بستی دیکھتا ہے جس کی دیواریں شیشے کی ہیں دو سال تک وہ اس بستی کی تلاش میں رہتا ہے مگر پھر اسے سمجھ آتی ہے کہ ایسی بستی خوابوں میں ہی مل سکتی ہے۔ وہ ارسلا کے ساتھ اسی جگہ پر گھر بناتا ہے جو جگہ خواب میں دیکھتا ہے ان کے ہاں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی پیدائش ہوتی ہے۔ یہ بستی دنیا سے الگ تھلگ ہے۔ دنیا کو اس بستی کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ یہ اپنی ہی دنیا میں آباد لوگ ہیں۔ ایک دن وہاں کچھ شعبدہ بازوں کا گروپ آجاتا ہے وہ لوگوں کو شعبدہ بازیاں دکھا کر پیسے بٹورتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں چرچ بنتا ہے اور ایک دن سرکاری مجسٹریٹ وہاں آن ٹپکتا ہے۔ بستی کا انتظام سرکار کے ماتحت کر دیا جاتا ہے۔ اب ہوتا ہے اس بستی میں سیاست کا آغاز۔ پہلے باہر سے لوگ آئے، پھر مذہب اور چرچ، پھر سرکار اور جب سیاست آگئی تو دو پارٹیاں وجود میں آگئیں، ایک لبرل پارٹی اور دوسری کنزرویٹو پارٹی۔ اختلافات شروع ہوئے اور بستی میں خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور بیس سال تک یہ خانہ جنگی جاری رہی اور جب یہ خانہ جنگی بند ہوئی تو کرنل اوریلیانو اس میں ہیرو بن کر آیا۔ ناول کے اختتام پر کرنل اوریلیانو چند دستاویزات پڑھتا ہے جن میں یہ درج ہوتا ہے کہ جو بستی ایک سو سال تک تنہائی کے حصار میں رہے وہ دوبارہ نہیں اٹھ سکتی اس کے ساتھ کچھ نیا نہیں ہو سکتا۔

مارکیز نے اس ناول میں چار چیزوں کا امتزاج بیان کیا ہے جن میں یاد، ماضی، خواب اور حقیقت ہے اور سب سے بڑھ کر جس حقیقت کا بیان ہے وہ ہے نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہے وہاں بالکل ویسے یہ نوآبادیاتی نظام کا آغاز ہوتا ہے جیسے ہندوستان میں ہوا۔ ایسی بستی جس کا اپنا نظام، اپنی زندگی ہے اور اپنا طرز معاشرت ہے جب اس پر بیرونی طاقتیں قابض ہوتی ہیں تو اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے پرانے لوگ نئے نظام کو اپنانے میں میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں جبکہ پرانا نظام وہ نہیں چھوڑ سکتے اور اس تضاد کی وجہ سے جو تباہی ہوتی ہے وہ کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ ایسا ہی اس ناول میں بھی ہوتا ہے۔ زہنت نے جو ترجمہ کیا ہے وہ ترجمہ نہیں بلکہ طبع زاد لگتا ہے اور اردو ترجمہ نگاری کے فن پر پورا اترتا ہے۔ ترجمے میں روانی اور سلاست کا

پہلو واضح ہے۔ لکھتی ہیں:

"دنیا اتنی تازہ تھی کہ بہت سی چیزوں کے کوئی نام نہ تھے اور اُن کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہوتا تھا۔"[۷]

نادیدہ شہر

اطالوی ادیب اتالو کلوینو مشہور و معروف ناول نگار تھے۔ زینت حسام نے نادیدہ شہر کے عنوان سے ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ناول میں شہنشاہ کی فرمائش پر درباری مختلف شہروں کا حال سناتا ہے۔ وہ بادشاہ کو ان مہمات کی داستان سناتا ہے جو اس نے ان شہروں کی سیر کے دوران سر کیں۔ مارکو پولو ناول میں پچاس کے قریب شہروں کا احوال سناتا ہے لیکن غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی شہر کا حال کہہ رہا ہے اور وہ ہے اس کا اپنا شہر وینس۔ ناول میں مارکو پولو شہر میں ہونے والی تجارت، معاشی لین دین کی کہانیاں اور شہر کے باشندوں کی کہانیاں سناتا ہے۔ کتاب کے نو ابواب ہیں لیکن لگتا ہے، اس ناول میں پورا شہر آباد ہے:

"قبلائی خان ہر اُس بات پہ لازماً یقین نہیں کرتا جو مارکو پولو اپنی مہمات کے دوران دیکھے شہروں کے بارے میں بتاتا ہے۔"[۸]

قبلائی خان تجسّس میں مبتلا ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ایا یہ شہر، یہ پراعظم، یہ بندرگاہیں حقیقت میں ہیں یا محض افسانوی داستانیں جو مارکو پولو نے اسے لطف اندوز کرنے کے لیے سنائی ہیں:

"قبلائی مارکو سے سوال کرتا ہے: "تم، جو کھوج میں لگے رہتے ہو اور علامتیں دیکھتے ہو، مجھے بتا سکتے ہو، ان میں سے کون سا مستقبل ہمیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے؟"[۹]

مگر مارکو انکشاف کرتا ہے کہ وہ نقشہ نہیں بنا سکتا۔ اور نہ ہی ان علاقوں میں قدم رکھ سکتا ہے۔

"میں ان بندرگاہوں کی طرف لے جانے والے راستوں کا نقشہ نہیں بنا سکتا اور نہ ہی وہاں قدم دھرنے کی تاریخ متعین کر سکتا ہوں۔"[۱۰]

زینت حسام کے تراجم کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی جدید دور کے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنی تعلیم کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اپنے گہرے اور وسیع علمی شعور سے ثابت کیا کہ آج کی عورت اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا ہنر جانتی ہے۔ انھوں نے صحافت کے شعبے میں اپنی

صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ بلاشبہ زاہدہ حنا جدید دور کی ترقی پسند خاتون ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۹ء)، ۱۳۔

۲۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی، "حمرا خلیق کی ترجمہ نگاری"، مشمولہ: چار کتابیں، مرتبہ: حمرا خلیق (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۱ء)، ۱۱۳۔

۳۔ کیم مونزو، "جہاں گرد" (افسانہ)، مترجمہ: زینت حسام، مشمولہ: مہر سکوت (منتخب ترجمے)، مترجمہ و مرتبہ: زینت حسام (کراچی: سٹی پریس، ۲۰۰۷ء)، ۴۶۔

۴۔ ایضاً، ۵۴۔

۵۔ اتالو کلوینو، "چاند کی دوری" (افسانہ)، مترجمہ: زینت حسام، مشمولہ: مہر سکوت (منتخب ترجمے)، مترجمہ و مرتبہ: زینت حسام، ۷۶۔

۶۔ یوسف ادریس، "الغریب" (افسانہ)، مترجمہ: زینت حسام، مشمولہ: مہر سکوت (منتخب ترجمے)، مترجمہ و مرتبہ: زینت حسام، ۱۴۱۔

۷۔ گابرئیل گارشیا مارکیز، تنہائی کے سو سال، مترجمہ: زینت حسام (کراچی: سٹی پریس بک شاپ، ۲۰۲۰ء)، ۲۵۴۔

۸۔ اتالو کلوینو، نادیدہ شہر، مترجمہ: زینت حسام (کراچی: سٹی پریس، ۲۰۱۲ء)، ۱۱۔

۹۔ ایضاً، ۵۰۔

۱۰۔ ایضاً، ۵۸۔